خودنوشت نگاری کے فروغ میں مجلّہ ''افکار'' کا حصہ

ڈاکٹر اشرف کمال*

Abstract:
This is a research study about the contribution of a literary journal "Afkar" in promotion of the tradition of literary auto biographies. The auto biographies of Akhtar Hussain Raipuri, Begum Hamida Akhtar Hussain, Khalique Ibrahim Khalique, Ada Jaafari, Sibte Hassan Ebadat Baralvi and other man of latter were firstly published in this journal in different episode. So it is remarkable that no literary Journal other than 'Afkar' Karachi published the auto biographies to promote this genre. This article reflects the different angles of this contribution.

خودنوشت تاریخ نہیں ہے لیکن اس میں تاریخی حقائق ضروری ہیں۔ یہ واقعات کا خشک بیان بھی نہیں ہے ان واقعات کے ساتھ جو کیفیات وابستہ ہیں ان کی داستان بھی ہے واقعات اس لیے اہم ہیں کہ ان واقعات نے کیا تاثرات اور کیفیات عطا کی ہیں یعنی ان سے دل پر کیا گزری ہے۔ آپ بیتی جگ بیتی بھی ہے کیونکہ اپنی زندگی میں ایک فرد اپنے خاندان، ماحول، علمی اداروں، تحریکوں، شخصیات، تہذیبی ادبی، معاشرتی اور سیاسی حالات سے دوچار ہوتا ہے ان سے بہت کچھ لیتا ہے اور شاید تھوڑا بہت ان کو دیتا بھی ہے بہر حال کوشش یہ ہونی چاہیے کہ لکھنے والا اپنے ساتھ ایمان داری برتے۔[۱] احمر رفاعی لکھتے ہیں

> ''یہ کسی فرد کی پیدائش سے وفات تک کے واقعات کی مفصل روئداد ہے جس میں زندگی کی اہم ترین جزئیات یعنی اعمال وافکار کا بھرپور احاطہ کیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے اسے کسی بھی زندگی کی مکمل ومفصل تاریخ کہا جاسکتا ہے۔''[۲]

اردو میں تخلیقی خودنوشت سوانح عمری کی مستقل روایت کا آغاز انیسویں صدی کے آخری عشروں کا واقعہ ہے۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل کی تحقیق کے مطابق پتمبر سنگھ کی تحریر کردہ خودنوشت سیر الاسلام (مشتری پریس کلکتہ ۱۸۲۰ء) اردو کی پہلی خودنوشت ہے اسی طرح شہر بانو کی خودنوشت بیتی کہانی مئی ۱۸۸۵ء اور عبدالغفور نساخ کی خودنوشت ۱۸۸۶ء اور جعفر تھانیسری کی خودنوشت سوانح عمری ۱۸۹۰ء کی تصانیف ہیں۔[۳] خودنوشت یا آپ بیتی دراصل کسی شخص کے ان مشاہدات وتجربات اور واقعات کی دستاویز ہوتی ہے جن سے اس شخصیت کا اپنی زندگی میں واسطہ پڑا۔ فرزانہ کوکب لکھتی ہیں:

* اُستاد شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد۔

''اردو آپ بیتی نگاروں میں مختلف ادباء کے علاوہ وہ شخصیات بھی شامل ہیں جو ادب کے علاوہ یا ادب سے ہٹ کر زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی ممتاز مقام رکھتی ہیں۔ان آپ بیتی نگاروں کے ہاں نہ صرف زندگی کے تلخ وشیریں تجربات' کچھ پورے ہونے والے اور کچھ ادھورے رہ جانے والے خوابوں کا بیان ملتا ہے بلکہ اپنی شخصیت اور زندگی کے بارے میں اکثر چونکا دینے والے دلچسپ انکشافات بھی موجود ہیں۔''[۴]

نیرنگی بخت بیگم انیس قدوائی کی اردو میں کسی خاتون کے قلم سے لکھی گئی پہلی خودنوشت ہے۔اردو آپ بیتیوں میں چوہدری افضل حق کی میرا افسانہ،عبداللہ سندھی کی ذاتی ڈائری،شاد عظیم آبادی کی شاد کی کہانی شاد کی زبانی، عبدالطیف بجنوری کی لطیف کی کہانی،رشید احمد صدیقی کی آشفتہ بیانی میری،رضا علی کی اعمال نامہ،حکیم احمد شجاع کی خون بہا،دیوان سنگھ مفتون کی ناقابل فراموش،ڈاکٹر سید اعجاز کی میری دنیا،یوسف حسین خان کی یادوں کی دنیا،کلیم الدین احمد کی اپنی تلاش میں،عبدالماجد دریابادی کی آپ بیتی،وامق جونپوری کی گفتنی ناگفتنی،رفعت سروش کی بستی نہیں بدلی ہے،بمبئی کی بزم آرائیاں،پتہ پتہ بوٹا بوٹا وغیرہ نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی گرد راہ،آل احمد سرور کی خواب باقی،اختر الایمان کی اس آباد خرابے میں، احسان دانش کی جہان دانش،مشتاق احمد یوسفی کی زرگزشت،مرزا دیب کی مٹی کا دیا،وزیر آغا کی شام کی منڈیر سے، کشور ناہید کی بری عورت کی کتھا،بیگم اختر حسین رائے پوری کی گرد راہ،جوش ملیح آبادی کی یادوں کی برات،مسعود حسین خان کی درود مسعود،سعیدہ احد بانو کی ڈگر سے ہٹ کر،ادا جعفری کی جو رہی سو بے خبری رہی،گیان سنگھ شاطر کا خودنوشت سوانحی ناول،زبیر رضوی کی گردش پا،حمیدہ سالم کی شورش دوراں اور ہم ساتھ تھے،ثمینہ درانی کی مینڈا سائیں،نفیس بانو شمع کی جنت سے نکالی ہوئی حوا وغیرہ اہم اور دلچسپ آپ بیتیاں ہیں۔محمد احمد سبزواری لکھتے ہیں

''خودنوشت جس کا آج کل بڑا چرچا ہے کافی قدیم صنف ہے برصغیر میں تزکِ بابری،تزکِ جہانگیری وغیرہ کی بڑی شہرت ہے۔خواتین نے بھی

''اس میدان میں جوہر دکھائے،گلبدن بیگم کا ہمایوں نامہ،بھوپال کی تین فرمانرواؤں کی آپ بیتیاں اس کا ثبوت ہیں''۔[۵]

اردو ادب میں خودنوشت نگاری کو قیام پاکستان کے بعد زیادہ عروج حاصل ہوا اور مجلّہ افکار نے مشاہیر ادب

کی سوانح حیات بہت اہتمام کے ساتھ شائع کیں۔

''افکار'' نے اپنے صفحات پر اردو کے بڑے بڑے نامور اور رجحان ساز شعراء وادباء کی خودنوشت سوانح عمریوں کو جگہ دے کر نہ صرف خودصنفِ خودنوشت نگاری کے خزانے میں اضافہ کیا ہے بلکہ ان شعراء وادباء کے حالات زندگی لکھوا کر ایک نئی تاریخ مرتب کردی ہے جس میں سسپنس بھی ہے، معلومات بھی، دلی جذبات کی ترجمانی بھی اور عصری حالات کی عکاسی بھی۔ افکار نے خودنوشت نگاری کو بحیثیت صنف اس مقام پر پہنچادیا ہے جس کی کہ یہ مستحق تھی۔ ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

> ''اگر چہ تخلیق وتنقید کے فروغ میں افکار کی ناقابلِ فراموش خدمات کا متعدد زاویوں سے جائزہ لیا جاسکتا ہے لیکن میری یہ ذاتی رائے ہے کہ افکار نے اور کچھ بھی نہ کیا ہوتا تو صرف خودنوشت سوانح عمریوں کی اشاعت کی بنا پر ہی افکار کا نام تاریخ ادب میں ممتاز ہوجاتا ہے۔ اس وقت معاصر جرائد میں سے ایک بھی ایسا پرچہ نہیں جس نے گزشتہ ربع صدی سے بطور خاص اہم ادبی اور تخلیقی شخصیات سے خودنوشت سوانح عمریاں لکھوانے کا اہتمام کیا ہو اور کیسی کیسی شخصیات ۔ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری (اور اب ان کی اہلیہ) ڈاکٹر عبادت بریلوی، محترمہ ادا جعفری، شان الحق حقی، خلیق ابراہیم خلیق۔''[٦]

''افکار'' نے جن ادباء وشعراء کی خودنوشت سوانح عمریاں شائع کی ہیں ان میں ڈاکٹر سید عبداللہ، سید بادشاہ حسین، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، قدوس صہبائی، یاس یگانہ چنگیزی، مجنوں گورکھپوری، سید سبط حسن، حکیم محمد یوسف، رام لعل، انور عنائت اللہ، محمد احمد سبزواری، شان الحق حقی، عبادت بریلوی، یونس احمر، خلیق ابراہیم خلیق، ادا جعفری، پروفیسر لالہ ایش کمار، شان الحق حقی، بیگم حمیدہ اختر حسین رائے پوری، پریم چند کی اہلیہ اور حمایت علی شاعر کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان کی مدد سے ہم ایک قوم، ملت اور ملک کی تہذیب کی ابتدا اور عہد بہ عہد ترقیوں کا اندازہ لگا سکتے ہیں جو تاریخ کے طالب علم کے لیے بڑی ضروری اور بڑی اہم ہے۔[٧]

افکار نومبر دسمبر ۱۹۶۴ء کے شمارے میں تلوک چند محروم اور شکیلہ اختر کی مختصر خودنوشت ''بقلم خود'' کے عنوان سے شائع کی گئی ہے۔ تلوک چند محروم لکھتے ہیں:

''۱۹۰۶ء میں دسویں یعنی ہائی اسکول کے آخری درجے میں تھا کہ رسالہ'' زمانہ
'' کان پور میں اور اس کے بعد ''مخزن'' لاہور میں نظمیں شائع ہونا شروع
ہوگئیں۔''(ص۲۰۰)

پروفیسر مجنوں گورکھپوری کی خودنوشت تین اقساط پر مبنی ہے۔ یہ خودنوشت افکار شمارہ مئی ۱۹۷۳ء سے شمارہ جولائی ۱۹۷۳ء تک شائع ہوئی ہے۔ یہ خودنوشت پروفیسر مجنوں گورکھپوری کی زندگی کے تین ادوار (بحیثیت شاعر۔ افسانہ نگار۔تنقید نگار) کا احاطہ کرتی ہے۔مجنوں گورکھپوری پہلے دور شمارہ مئی ۱۹۷۳ء میں لکھتے ہیں:

'' جب ۱۹۱۶ء میں بارہ سال کی عمر میں میرا داخلہ گورکھپور کے مشن اسکول کی
چھٹی جماعت میں ہوا تو میں ایسے اشعار کہہ رہا تھا۔ کہ اسکول کے وہ اساتذہ
جو شاعری کا ذوق رکھتے تھے نہ صرف خوش ہوتے تھے بلکہ میرے کسی شعر میں
کبھی کوئی عیب نہیں پاتے تھے۔''(ص۳۰)

شمارہ جون ۱۹۷۳ء خودنوشت کے دوسرے دور میں مجنوں گورکھپوری نے اپنی افسانہ نگاری، اپنے پہلے افسانے اور علامہ نیاز فتح پوری کی جانب سے ملنے والی حوصلہ افزائی کا ذکر کیا ہے۔ وہ اپنے نثری میلان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اردو نثر میں میرا اپنا میلان ایسے علمی موضوعات کی طرف تھا جن کا اردو میں
فقدان تھا۔''(ص۱۶)

اس خودنوشت کے تیسرے دور میں پروفیسر مجنوں گورکھپوری نے اپنی تنقیدی کارناموں اور کاوشوں پر روشنی ڈالی ہے۔

'' خالص ادبی تنقید میں نے ۱۹۳۰ء سے شروع کی اور میری پہلی ادبی تنقید وہ
مضمون ہے جو میں نے زہر عشق پر لکھا اور جو زہر عشق شائع کردہ ایوانِ
اشاعت میں مقدمہ کے طور پر شامل ہے۔''

(جولائی ۱۹۷۳ء قسط۲،ص۱۶)

ڈاکٹر سید عبداللہ کی خودنوشت شمارہ اکتوبر ۱۹۷۳ء تا نومبر ۱۹۷۴ء تک تیرہ اقساط پر محیط ہے۔عنوانات میں ابتدائی حالات، علم وتعلیم کا پس منظر علی گڑھ کی یاد میں، چند ماہ جیل میں۔علم وتعلیم کے مرحلے، کچھ اپنے اساتذہ کے

بارے میں، ملازمت تحقیق اور درس وتدریس کے مرحلے، پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں، کچھ اپنی تدریس کے بارے میں، مناصب اعزازات' خدمت اردو' معالعہ ادب، تصور تعلیم' کلچر' مشرب ومسلک، تصنیفی ادبی زندگی شامل ہیں۔ وہ آپ بیتی کے فن کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''آپ بیتی کی ایک کمزوری یہ بھی ہے کہ اس میں مصنف یا تو سب کچھ چھپا جاتا ہے یا بہت بننے کی کوشش کرتا ہے اور مبالغے سے کام لیتا ہے۔''[۸]

ڈاکٹر سید عبداللہ دسمبر ۱۹۷۳ء سجاد ظہیر ایڈیشن میں عجائب البلاد لاہور کا ذکر کرتے ہوئے لاہور کے تاریخی مقامات، مزارات، باغوں، شاہی مسجد، قلعہ، دینی مدارس، اسکول اور کالج، سیاسی سرگرمیوں، مختلف تحریکوں، جلوسوں، کھانے پینے کی دکانوں کا خصوصی تذکرہ کیا ہے جس سے اس وقت کے لاہور اور اس کی تہذیب وثقافت کی پوری تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔

''لاہور کے روغنی نان، فالودہ، قتلمے، لچیاں، خطائیاں، قیمے والی روٹیاں اور بیسنی روٹیاں ہمیشہ مرغوب رہیں ۔۔۔ چوک وزیر خان میں مَہنّی فالودے والے کی دکان مرجع خلائق تھی ۔۔۔ رنگ محل بازار میں سری پائے بہت عمدہ تیار ہوتے تھے ۔۔۔ لاہور میں چائے کا عام رواج ۱۹۳۰ء کے بعد ہوا اس سے پہلے کشمیری چائے تو مل جاتی تھی مگر کالی چائے صرف شاہ محمد غوث میں پٹھان دکانداروں کے یہاں دستیاب ہوتی تھی۔'' (ص ۱۳۲)

سید بادشاہ حسین کی خودنوشت افکار کے شمارہ اپریل ۱۹۷۵ء سے ستمبر ۱۹۷۵ء تک چھ اقساط پر مبنی ہے۔ اس خودنوشت میں انھوں نے اپنے حالات زندگی اور معمولات پر روشنی ڈالی ہے۔ خودنوشت لکھنا باقی تمام اصناف ادب کی نسبت مشکل اور دشوار کام ہے۔ بیتی ہوئی باتوں اور بھولی ہوئی یادوں کو سمیٹنے میں خاصی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آل احمد سرور لکھتے ہیں:

''خودنوشت تاریخ نہیں ہے مگر اس میں تاریخی حقائق ضرور ہیں یہ واقعات کا خشک بیان بھی نہیں ہے ان واقعات کے ساتھ جو کیفیات وابستہ ہیں ان کی داستان بھی ہے واقعات اس لیے اہم ہیں کہ ان واقعات نے کیا تاثرات اور کیفیات عطا کی ہیں یعنی ان سے دل پر کیا گزری ہے۔''[۹]

اختر حسین رائے پوری کی خودنوشت گردِراہ کے عنوان سے شمارہ اپریل ۱۹۷۶ء سے نومبر ۱۹۷۶ء تک سات اقساط پر مشتمل ہے۔انھوں نے گردراہ،سفرزندگی کا آغاز،قیام علی گڑھ،دکن میں دوسال،سفر پیرس،قرارداد پاکستان کا پس منظر، پاکستان ناگزیر تھا جیسے عنوانات کے تحت یہ خودنوشت تحریر کی ہے۔شمارہ اپریل ۱۹۷۶ء میں وہ اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''میری عملی زندگی کے تیس سال تعلیمی مشاغل میں صرف ہوئے ۔ یہ سلسلہ ۱۹۴۲ء میں ایم .اے .او کالج (امرت سر) کی پروفیسر سے شروع ہوکر۱۹۷۲ء میں ختم ہوا جب میں اقوام متحدہ کے ادارہ یونیسکو کی ملازمت سے رٹائر ہوا۔اس دوران میں مجھے برطانوی حکومت ہند کے معاون مشیر تعلیم،حکومت پاکستان کے مشیر تعلیم کے فرائض انجام دینے پڑے۔''(قسط ا،ص ۱۹)

شمارہ جولائی ۱۹۷۶ء میں اپنی شادی کے حوالے سے بات کرتے ہوئے ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری لکھتے ہیں:

''مولوی صاحب کے نام ان کے پرانے دوست ظفر عمر صاحب کا خط علی گڑھ سے آیا وہ پولیس کے اعلیٰ افسر تھے۔ نیز نیلی چھتری، بہرام کی گرفتاری وغیرہ ۔جاسوسی ناولوں کے مصنف تھے۔علی گڑھ سے چلتے وقت میں ان کی صاحبزادی حمیدہ کا خواست گار ہوا تھا اس جسارت پر وہ کبیدہ خاطر ہوئے لیکن فیصلہ مولوی صاحب پر چھوڑ دیا۔۔۔اس طرح کچھ عرصہ بعد میری شادی ہوگئی اور جب تک حمیدہ حیدرآباد میں رہیں مولوی صاحب نے ان سے بیٹی کا سا سلوک کیا اور گھر کا انتظام ان کے سپرد کردیا۔''(قسط ۴،ص ۱۵)

اختر حسین رائے پوری نے اپنی خودنوشت میں اپنے ابتدائی حالات زندگی،قیام کلکتہ کے نت نئے تجربات، قرارداد پاکستان،آزادنظم اورن۔م راشد،سعادت حسن منٹو،ہندوستان میں بورژوا طبقہ کا آغاز وارتقا،امرت سر میں قیام،کوہ نوردی کا شوق اورادبی معرکوں کی داستان بیان کی ہے۔شمارہ ستمبر ۱۹۷۶ء میں وہ لکھتے ہیں:

''راشد سے میرا تعلق دہلی سے شروع ہوکر تہران تک باقی رہا۔ دوسال بعد ریڈیو سے ہم سب کا دل اس طرح اچٹا کہ کرشن چندر،منٹو وغیرہ کو فلم کی کشش بمبئی لے گئی۔راشد اور حسرت فوج میں کپتان بن گئے اور میں نے ایم اے او

کالج امرت سر کی راہ لی۔'' (قسط ۶،ص ۱۷)

اختر حسین رائے پوری نے سات اقساط میں اپنی آدھی سے زیادہ خودنوشت تحریر کردی ہے۔ شمارہ اکتوبر ۱۹۷۶ء میں خانہ جنگ اور سامراجیت کی جان کنی، پاکستان ناگزیر تھا، مولانا آزاد کے ساتھ چند ماہ اور ہجرت کر کے پاکستان جانے کے دوران پیش آنے والے اندوہناک واقعات اور پاکستان کے ابتدائی دور پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ۱۹۵۵ء تک کے حالات رقم کیے ہیں۔

''یونیسکو نے جب میری خدمات طلب کیں تو میں پیرس چل پڑا۔ اس وقت یہی طے پایا تھا کہ دو تین سال کے بعد وزارت لوٹ آؤں گا لیکن لگ بھگ ۱۷ سال یونیسکو کی ملازمت میں گزار دیے اور اب اس کا وظیفہ خوار ہوں۔''

(قسط ۷،ص ۳۰)

گرد راہ ایک آپ بیتی ہی نہیں تہذیب وثقافت، علم وادب اور تعلیم وتاریخ کے حوالے سے ایک جگ بیتی بھی ہے اور نصف صدی سے زیادہ مدت پر محیط ہے۔[۱۰] اختر حسین رائے پوری کی اس خودنوشت سے ان کی زندگی کے بہت سے پہلو روشن ہو کر سامنے آجاتے ہیں جس سے ہمیں نہ صرف ان کی زندگی بلکہ اس دور کے سیاسی وادبی اور معاشرتی حالات سے بھی آگاہی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر ندیم احمد لکھتے ہیں:

''اختر حسین رائے پوری کی خودنوشت گرد راہ تخلیقی، لسانی اور اسلوبی خصوصیت کی آئینہ دار ہے۔ یہاں ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ خودنوشت اپنے عہد اور مصنف کے احوال کی بھرپور عکاسی کرتی ہے گرد راہ کو ادبی اور سیاسی خودنوشتوں میں نمایاں مقام حاصل ہے۔''[۱۱]

اس خودنوشت میں اختر حسین رائے پوری نے اپنے آباؤ اجداد کا تذکرہ، اپنے بچپن کی یادیں، تعلیمی زندگی، ملازمت اور ملازمت کے دوران مختلف ممالک میں یونیسکو کے سفیر کی حیثیت سے جو کچھ دیکھا، محسوس کیا اس کا نچوڑ شامل ہے۔ انھوں نے ٹیگور، مولوی عبدالحق، مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت جواہر لال نہرو، سر شیخ عبدالقادر جیسی شخصیات سے ملاقات کے علاوہ اسپین میں خانہ جنگی اور دوسری جنگ عظیم کے آغاز کے بارے میں بھی معلومات فراہم کی ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''خودنوشت کو سوانح نگار کی ذات وصفات اور اردگرد کی تہذیبی کائنات کے

تعلق سے حقیقتاً کیا ہونا چاہیے'' گردراہ'' اس کا خوبصورت اور بھرپور جواب ہے۔''[۱۲]

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اپنی خودنوشت گردراہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''یہ سوانح حیات نہیں بلکہ ایسی تحریر ہے جس میں آپ بیتی کم اور جگ بیتی زیادہ ہے۔''[۱۳]

قدوس صہبائی کی خودنوشت افکار کے شمارہ اپریل ۱۹۷۷ء سے شمارہ ستمبر ۱۹۷۷ء تک چھ(۶) اقساط پر مبنی ہے۔اس خودنوشت کو پڑھ کر ان کے حالات زندگی اور ملکی و بین الاقوامی حالات کے ساتھ ساتھ ادبی و سیاسی تاریخ کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ان کی خودنوشت کے عنوانات ابتدائی زندگی کے مرحلے، رئیس احمد جعفری کی مخالفت، انجمن رعایائے بھوپال، انجمن خدام وطن، ہند کا یادگار زمانہ، چند مہینے بھوپال میں کچھ عرصہ کراچی اور بلوچستان میں، جنگ عالمگیر، جیل ایک ادیب کے لیے بہتر، ہندوستان چھوڑ دو، بمبئی میں فسادات، لاشوں کا شہر، فروری ۴۰ء کی بغاوت، میں اور پریم ساگر، بمبئی الٹ گیا، بمبئی میں تحریک پاکستان،، ادب ہنگامی دور میں، صوبہ سرحد میں، ماہِ ستمبر یا ماہِ ستمگر ایک تجزیاتی جائزہ، ماہ ستمگر شامل ہیں۔

یاس یگانہ چنگیزی کی خودنوشت دو اقساط (اکتوبر، نومبر ۱۹۷۷ء) پر مشتمل ہے۔ پہلی قسط میں نام ونسب ،ولادت وتعلیم، سیاحت قیام لکھنؤ، تربیت وتلمذ، معیار پارٹی، شاعری کیا ہے وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس خود نوشت کی دوسری قسط شمارہ نومبر ۱۹۷۷ء میں زیادہ تر فنی حوالے سے بات کی گئی ہے اور میر تقی میر، مرزا غالب اور ناسخ وغیرہ کے کلام سے مثالیں پیش کی گئی ہیں۔کلام ناسخ اور''ی'' کا استعمال کے عنوان سے یاس یگانہ چنگیزی لکھتے ہیں:

''لکھنؤ میں عارف، رشید، جاوید اور شوق قدوائی وغیرہ کی زبان سے یہی سنتا تھا کہ ناسخ نے اس کی پابندی بہت کی ہے اور ہر شخص سے یہی سنا کہ ناسخ نے دیوان بھر میں بس ایک جگہ ی گرائی ہے اور وہ یہ ہے

؎ خوف بد ہضمی کا ناسخ نہیں غم کھاتے ہیں

لکھنؤ میں جس سے پوچھیے ناسخ کا یہی مصرعہ پڑھتا ہے یعنی اس کے سوا اور کہیں ناسخ نے ی نہیں گرائی۔۔میں نے دیوان ناسخ سے بہت سے اشعار نکالے ہیں جہاں ی گرتی ہے۔'' (ص ۱۷)

پروفیسر مجنوں گورکھپوری کی داستانِ حیات مجنوں کی زبانی کے عنوان سے جولائی ،اگست ۱۹۷۸ء کے شماروں میں شائع ہوئی ۔ جسے احمد رئیس نے ترتیب دیا ہے۔اس خودنوشت میں ترقی پسند تحریک، انجمن ترقی پسند مصنفین کے اجلاس ،انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنسیں، ترقی پسند ادبی رسائل وجرائد، ترقی پسند شعراء، اور ہم عصر نقادوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

سید سبط حسن کی خودنوشت جنوری ۱۹۷۹ء کے شمارے میں پیش کی گئی ۔حکیم محمد یوسف کی خودنوشت کے چند اوراق ''آخری بات'' کے عنوان سے اکتوبر ۱۹۷۹ء کے شمارہ میں اور رام لعل کی خودنوشت'' پنجاب کی یاد میں'' جنوری ۱۹۸۰ء کے شمارہ میں شامل ہے۔انور عنایت اللہ کی خودنوشت اپریل ۱۹۸۰ء سے جنوری ۱۹۸۱ء تک کے شمارہ میں دس اقساط پر مبنی ہے۔اس خودنوشت میں انور عنایت اللہ نے اپنی ولادت ،ابتدائی حالات ،زندگی کے المیوں، گوندیا کی ادبی فضا ،اس وقت کے سماجی واخلاقی رویوں ،رائے پور کی ادبی کانفرنس، کلکتہ شہر، جمشید پور اور حیدرآباد کے حوالے سے لکھا ہے۔

محمد احمد سبزواری کی خودنوشت شمارہ جون ۱۹۸۱ء سے شمارہ مئی ۱۹۸۲ء تک بارہ اقساط پر مشتمل ہے ۔ یہ خود نوشت پس منظر، بھوپال کی قدیم معاشرت، بھوپال میں علی گڑھ کی مقبولیت، اخبارات کی اہمیت دکن کی کہانی، مدینتہ العلم جامعہ عثمانیہ، نواب بھوپال کی سیاسی بصیرت، بھوپال کی ممتاز شخصیتیں اور یادگار محفلیں، نئے بام ودر، ملکوں ملکوں کا سفر، اٹک پار، ملازمت سے سبکدوشی اور اس کے بعد، داتا نگری سے لی سرتھو تک کے عنوانات پر مبنی ہے۔

شان الحق حقی کی خودنوشت شمارہ اگست ۱۹۸۲ء سے مئی ۱۹۸۳ء تک دس اقساط پر مبنی ہے۔جس کے عنوانات افسانہ در افسانہ، اعصاب کی آزمائش، گل افشانی کردار، تندرستی ہزار نعمت ہے، ڈاکٹر اشرف الحق اور کچھ دوسرے لوگ، کشاکش روزگار، آشوب کلکتہ، گزری ہوئی صدائیں، آغاز مہاجرت، دوسری عالمگیر جنگ ہیں۔

شان الحق حقی کی خودنوشت کی دس قسطیں شائع ہونے کے بعد شان الحق حقی کی مصروفیات کی بنا پر یہ سلسلہ تعطل کا شکار ہوگیا ۔اس خودنوشت کا دوسرا دور جنوری ۱۹۹۲ء سے شروع ہوا۔ یہ جنوری ۱۹۹۲ء سے اپریل ۱۹۹۴ء تک ۲۸ قسطوں پر محیط ہے۔اس کے عنوانات میں تذکرہ تعلیم کا کچھ ہنسنے رونے کی باتیں، ہمارے اساتذہ، صحافت ،ادارت اور ایک قبیح شرارت، افسانہ در افسانہ، عزیز احمد اور حیدرآباد کا کچھ تذکرہ، کچھ بھول چوک کی باتیں، بام دنیا کا پھیرا، اختر حسین کی شادی، میرے عہد کی سیاست، جاں نثار اختر، چار شاعروں کا تعارف، حجامت سے معیشت اور شامت اعمال تک، بے زبان بے کھوٹ کپٹ ساتھی، ابتدائی ورزش سخن، مزید سخن ورزیاں ،بدعات

وبدیعات، بھٹیار خانے سے شاہی محل تک، خیال کی رو بے روزگاری سے نظم نگاری تک، نشید حریت' قدر مشترک' سیمیا، مسز جین حق کے ہند انگریزی ناول، بغلی گھوڑا سر پہ آرے منہ پہ اف، آمدِ سرآمدِ سخن، آمدِ سرآمدِ سخن ۲، آمدِ سر آمدِ سخن ۳، عمر بھر کی کمائی، ترقی اردو بورڈ' اعزازی سیکرٹری مقرر ہونے کی داستانِ ترقی اردو بورڈ شامل ہیں۔

افکار مارچ ۱۹۹۳ء کے شمارہ، قسط ۱۵ میں شان الحق حقی اپنی ابتدائی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''شعر کسی نہ کسی وقت اور کسی نہ کسی بہانے ہوتے رہتے تھے۔ غزل اور نظم کے علاوہ حمد، نعت، منقبت، پہیلیاں، کہہ مکرنیاں، بچوں کی نظمیں، ریختی، تاریخی قطعات، تضمین، منظوم تراجم اور منظوم خطوط بھی لکھے۔ یہ خطوط میں اپنے بڑے بھائی مشرف کو لکھتا تھا۔'' (ص ۱۹)

شان الحق حقی قدیم دہلی کی مستند چٹخارے دار زبان لکھتے ہیں اور اپنی زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات کو خوبصورتی سے اپنی خودنوشت میں سمو دیتے ہیں۔

[۱۴]

ڈاکٹر عبادت بریلوی کی خودنوشت افکار کے شمارہ جنوری ۱۹۸۴ء سے ستمبر ۱۹۸۵ء تک اکیس قسطوں پر مشتمل ہے اس کے عنوانات میں پٹھانوں کی ایک بستی' یادِ عہدِ رفتہ' پیش لفظ، کچھ اپنے آباؤ اجداد کے بارے میں، دادا میاں کی باتیں، بریلی اور لکھنؤ کی چند یادیں، لکھنؤ کی تفریحات اور مشاغل، لکھنؤ کا محرم، امین آباد اسکول سے جوبلی کالج تک، میرے ہم جماعت آغا حسن عابدی، لکھنؤ یونیورسٹی کی فضاؤں میں، لکھنؤ یونیورسٹی کی یادیں، تلاش معاش، اینگلو عربیک کالج دہلی، دہلی کی یادگار محفلیں (قیام پاکستان کا اعلان)، آشوب قیامت، پرانے قلعے کی اندوہناک یادیں، گاندھی جی کا قتل، دہلی کالج، کشمیر اور جوش صاحب، اورینٹل کالج لاہور میں، چند ناقابل فراموش واقعات (۱۹۷۷ء تک) شامل ہیں۔

یونس احمر کی خودنوشت جولائی ۱۹۸۶ء کے شمارے سے اگست ۱۹۸۷ء کے شمارہ تک ۱۴ قسطوں پر محیط ہے۔ اس خودنوشت میں انھوں نے اپنے شہر کی تاریخ اور اس کی معاشرت، مکتب کی تعلیم اور اسکول میں زمانہ طالب علمی شاعری کے شوق اور مختلف ادبی رسائل اور اخباروں کا مطالعہ، بنگلہ زبان سے دلچسپی، تحریک پاکستان اور اس وقت کے حالات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ جولائی ۱۹۸۶ء کے شمارہ قسط ۱، میں وہ اپنی جوانی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''میں جس دور میں جوان ہوا وہ اس لحاظ سے انتہائی اہم ہے کہ اس میں بڑے بڑے ادیب شاعر اور مفکر حیات تھے اور ان کے نظریات وخیالات نوجوانوں کے ذہنوں کو متاثر کررہے تھے۔ برعظیم میں دو عظیم شاعر اقبال اور ٹیگور کی شاعری کا چراغ چاروں طرف اپنی روشنی بکھیر رہا تھا۔'' (ص ۲۱)

یونس احمر کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ اگست ۱۹۸۶ء کے شمارہ قسط ۲ میں وہ کلکتہ شہر کے نام اور قیام کے بارے میں لکھتے ہیں

''کہاں گئے وہ آرمینی تاجر جو سود کا کاروبار کرتے تھے اور کہاں گئے جان چار نوک کے مالک ومختار انگریز جنھوں نے پرتگیزیوں کے خوف سے کالی کٹ سے فرار ہوکر سوتانوٹی میں پناہ لی اور پھر انھوں نے سوتانوٹی کو کالی کٹ کے نام پر کلکتے کا نام دیا۔۔۔۱۶۹۰ء میں اس کی بنیاد پڑی۔۔۔کلکتہ دریائے ہگلی کے کنارے آباد ہے۔'' (ص ۱۸)

اس خودنوشت میں انھوں نے مولوی فضل حق، کلکتے کا ادبی صحافتی اور سیاسی افق، مرشد آباد کا سفر، آری باسیوں کے گھر میں، دلی جو ایک شہر تھا، حشر بداماں سال، جوش کی صدارت میں ہندی اردو مشاعرہ، بھیمڑی ادبی کانفرنس میں شرکت، گورنر جنرل غلام محمد کے ساتھ دریائی یاترا، ایک چکر ہے میرے پاؤں میں، خوش رنگ پھولوں اور پرندوں کی سرزمین۔ چاٹگام، بہار آخر شد کے عنوانات سے اپنے حالات زندگی پر روشنی ڈالی ہے۔ یونس احمر کی خودنوشت کے حوالے سے واصل عثمانی لکھتے ہیں:

''یونس احمر صاحب کی سوانح بڑی دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔ خاص طور سے جنگ آزادی کی تاریخ، اس وقت کے حالات وخدشات کا صحیح نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ ان کے قلم میں غضب کی روانی اور اردو الفاظ کے صحیح استعمال کا خاص انداز ہے''۔[۱۵]

بہار آخر شد کے عنوان سے افکار اگست ۱۹۸۷ء کے شمارہ میں یونس احمر کی خودنوشت کی آخری قسط شائع ہوئی۔ اس میں یونس احمر اپنی خودنوشت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''یادداشت کی آخری قسط بھی لکھ ڈالی۔ لیکن کیا اس کے سوتے یہیں خشک ہوگئے ہیں۔ نہیں۔ یادداشت میں تو ابھی زندگی کے بہت سارے اسرار ورموز

ایسے ہیں جو حیطۂ تحریر میں نہیں آ سکے۔ بعض مصلحتیں ایسی ہوتی ہیں جو قلم کو آگے چلنے سے روک دیتی ہیں۔ میں بھی بہت ساری مصلحتوں کا شکار ہو گیا ہوں۔ اپنی زندگی کے بہت سے واقعات پر دانستہ میں نے پردہ ڈال دیا ہے تا کہ غم واندوہ کے بپھرے ہوئے سیلاب سے بچ سکوں۔ اب معلوم ہوا کہ انسان فطرتاً کتنا کمزور اور بزدل ہے۔'' (ص ۵۹، ۶۰)

خلیق ابراہیم کی خودنوشت افکار کے شمارہ ستمبر ۱۹۸۷ء سے مارچ ۱۹۸۹ء کے شمارہ تک بیس اقساط پر پھیلی ہوئی ہے۔ یہ خودنوشت میرے لڑکپن اور نوجوانی کا لکھنؤ لکھنؤ ۱۸۸۰ء سے ۱۹۳۶ء تک لکھنؤ ۱۸۸۰ء سے ۱۹۳۶ء تک لکھنؤ ۱۸۸۰ء سے ۱۹۳۶ء تک لکھنؤ ۱۸۸۰ء سے ۱۹۳۶ء تک لکھنؤ ۱۸۸۰ء سے ۱۹۳۶ء تک لکھنؤ ۱۸۸۰ء سے میرے احباب، عشرۂ ماقبل آزادی کے سیاسی حالات، عشرۂ ماقبل آزادی کے ثقافتی حالات، ترقی پسندوں کی ادبی خدمات (لکھنؤ کی عمومی ادبی فضا)، چند یادگار شخصیتیں، لکھنؤ کے شب وروز، جوش اور نیا ادب کا حلقہ کے عنوانات کے حوالے سے لکھی گئی ہے۔ ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

''خلیق ابراہیم خلیق کی خودنوشت اب سوانح عمری ہی نہیں رہی۔ یہ سوانح ملکی بن گئی ہے اور ایک مخصوص دور کے تہذیبی نقوش کا مرقع نظر آتی ہے۔'' [۱۶]

خلیق ابراہیم خلیق نے اپنی خودنوشت کی دوسری قسط شمارہ اکتوبر ۱۹۸۷ء میں لکھنؤ کے حالات وواقعات لکھنؤ میں پردے کی مخالفت، بیبیوں کی لڑائی اور مولانا عبدالحلیم شرر کے حوالے سے تفصیلی بات کی ہے۔ لکھنؤ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''۱۸۸۰ء سے ۱۹۳۶ء تک کے لکھنؤ میں قدیم وجدید کی آویزش اور پیکار کے ساتھ مشرق کی صحت مند اقدار وروایات کی بازیافت کا عمل بھی جاری تھا، لیکن بازیافت کا یہ عمل قدامت پرستی یا عصبیت پر مبنی نہیں تھا۔ اس کا مقصد مٹتی ہوئی تہذیب کے ان عناصر کو زندہ اور باقی رکھنا تھا جو صنعتی عہد کے بدلتے ہوئے حالات میں نئی تہذیب اور نئے تمدن کی تشکیل میں ممد ومعاون ثابت ہو سکتے ہیں۔'' (ص ۱۷)

خلیق ابراہیم خلیق کی خودنوشت صرف ان کی سوانح تک محدود نہیں ہے بلکہ اس سے بہت سی معلومات حاصل

ہوتی ہیں خلیق ابراہیم خلیق کی سوانح عمری کے حوالے سے ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

''اس خودنوشت میں شخص کم اور معاشرہ زیادہ سامنے آتا ہے چنانچہ اسے شخصی سوانح عمری کہنے کے بجائے تہذیبی سوانح عمری کہنا زیادہ مناسب ہے۔''[۱۷]

خلیق ابراہیم خلیق اپنے دوستوں اور احباب کے ذیل میں خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، سید یوسف علی، نوراللہ، اشفاق حسین، شوکت صدیقی، علی مظہر رضوی، اظہار حیدر رضوی، شبیر احمد علوی، قیصر تمکین، عبدالقوی ضیاء، منور آغا، مجنوں، جاں نثار اختر، کیفی اعظمی، ظ۔انصاری، صفدر میر اور اختر الایمان وغیرہ کے بارے شمارہ ستمبر ۱۹۸۸ء میں لکھتے ہیں:

''میں کم گو، کم آمیز اور دیر آشنا واقع ہوا ہوں، مگر لڑکپن اور نوجوانی میں میرے احباب اور شناساؤں کا حلقہ خاصا وسیع تھا۔اس حلقے میں مجھ سے بڑی عمر کے لوگ بھی تھے، میرے ہم عمر بھی اور مجھ سے کم عمر بھی اس میں مجاز، منمتھ ناتھ گپتا، سید احتشام حسین اور ڈاکٹر محمد احسن فاروقی بھی تھے، سلام مچھلی شہری اور منیش سکسینہ بھی اور محمد حسن اور منظر سلیم بھی۔'' (قسط ۱۳، ص ۱۹)

ادا جعفری کی خودنوشت افکار کے شمارہ اپریل ۱۹۸۹ء سے نومبر ۱۹۹۰ء تک انیس اقساط پر مبنی ہے۔ بدایوں کے شام وسحر، جہاں میں تھی، مہربان لمحے، آئینہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھایئے، روشنی کی لکیر، مسافتوں کے درمیان، دشت میں سامنے تھا خیمۂ گل، ورنہ سفر حیات کا بے حد طویل تھا، شہر عزیزاں، ایک سب آگ ایک سب پانی، آمش، موج ہوا کے ساتھ ساتھ، غلام گردشیں، سلسلے، شہر کو سیلاب لے گیا، منزل منزل جیسے عنوانات کے تحت یہ خودنوشت رقم کی گئی ہے۔

اس خودنوشت میں ادا جعفری نے اپنے خاندانی پس منظر، آبائی شہر اور اس کی تاریخ، اس دور کی معاشرت، شادی، اولاد، مختلف شہروں میں قیام، ادبی حلقوں کا قیام اور مختلف اہم شخصیات سے ملاقاتوں کا ذکر کیا ہے۔محمد احمد سبزواری لکھتے ہیں:

''عورت کے ساتھ ساتھ معاشرے کے ناروا سلوک کا جا بجا تذکرہ ہے۔ مجھے اس میں جگہ جگہ مامتا کا پیار اور مادری جذبے کی سچی تڑپ کی جھلکیاں بھی دکھائی دیں جو ہماری قدیم مشرقی خاتون کا طرۂ امتیاز تھیں گودلّی کی نہیں مگر زبان تسنیم

وکوثر میں دھلی ہوئی ہے۔سرگزشت ناول کی طرح دلچسپ ہے۔'' [۱۸]

ادا جعفری کی خودنوشت کی پہلی قسط شمارہ اپریل ۱۹۸۹ء میں ''بڑی حویلی'' کے عنوان سے ہے۔ادا جعفری نے اس قسط میں اپنے ماں باپ اورننھیال کا ذکر کیا ہے۔اس خودنوشت کے بارے میں ادا جعفری لکھتی ہیں

''یہ ایک ایسی زندگی کی کہانی ہے جو کہانی بھی نہیں ہے۔ہاں ایک خاص زمانے کے رنگِ تہذیب،طرزِفکر اور طریقِ معاشرت سے دوبارہ ملاقات یا تعارف کی کچھ نہ کچھ حیثیت ضرور رکھتی ہے۔وہ دکھ اور سکھ جو گئے زمانوں میں برتے ان کی حقیقت سے انکار ممکن ہی نہیں ہے۔وہ تو اب تک رگوں میں خوں کے ساتھ رواں دواں ہیں جب کہ وہ ماحول جس میں میں نے آنکھ کھولی اور ہوش سنبھالا آج ناقابلِ یقین حد تک اجنبی ہو چکا ہے۔''(ص ۱۷)

ادا جعفری بدایوں میں پیدا ہوئیں جہاں تاریخی عمارات اور مزارات بھی تھے۔اس خودنوشت کو پڑھ کر بدایوں کی تاریخ کا بھی پتہ چلتا ہے۔ادا جعفری لکھتی ہیں

''مسلمان بادشاہوں میں اسے سب سے پہلے قطب الدین ایبک نے فتح کیا اور یہ دلّی کی سلطنت کی شمالی سرحد اور ایک اہم فوجی چوکی قرار پایا۔بدایوں کو ''مدینتہ الاولیاء'' اور پیراں شہر بھی کہا جاتا ہے۔جہاں نہ صرف آبادی کے باہر بلکہ گلی گلی میں شہیدوں کے مزار تھے۔''(ص ۱۹،۲۰)

ادا جعفری نے امیر خسرو، تاج الدین سنجر قتلو، شمس الدین التمش، حضرت نظام الدین اولیاء اور ان کے اجداد، عہد اکبری کے عالم، شاعر اور مؤرخ عبدالقادر بدایونی، شیخ حسام الدین ملتانی اور سات احمدوں کے مزارات، ملک الشعراء شہاب الدین کی آخری آرام گاہ روضہ سلطان علاء الدین اور خواجہ حسن سنجری کے مولد و مکتب کے حوالے سے اس شہر کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے اور بڑی حویلی کا بطور خاص ذکر کیا ہے جس میں ان کی رہائش تھی۔شمارہ مئی ۱۹۸۹ء قسط ۲ میں ان کے محسوسات کو ملاحظہ کیجئے:

''ایک دن حسب معمول گھر والوں کی نظر بچا کر جب میں اوپر پہنچی تو حیران رہ گئی نارنگی کے بوٹے کی شاخ شاخ شگوفوں سے لدی ہوئی تھی یہ منظر جمال ابھی تک میری نگاہوں سے اوجھل کیسے رہا اور کیوں رہا۔میں ٹھٹک کر رہ گئی پھر وہیں

ان کے پاس منڈیر پر بیٹھ گئی۔انھوں نے مجھے خوشبو کا تحفہ دیا۔''(ص۲۴)

ادا جعفری نے اپنی اس خودنوشت میں صرف اپنے حالات زندگی ہی کے مختلف گوشوں کو بے نقاب نہیں کیا بلکہ اس میں انھوں اپنے ہم عصر شعرا و ادبا کا احوال بھی رقم کیا ہے ادا جعفری کی خودنوشت کے حوالے سے ڈاکٹر ندیم احمد لکھتے ہیں:

> ''ادا جعفری نے اس خودنوشت میں ترقی پسند تحریک سے لے کر ہندوستان پاکستان اور بیرونی ملکوں کے سینکڑوں شاعروں اور ادیبوں پر انپیرائے بہت نپے تلے انداز میں دی ہے۔آخر میں ہم یہ کہ کہہ سکتے ہیں کہ اردو خودنوشت سوانح عمری کی روایت کو آگے بڑھانے میں یہ ایک اہم آپ بیتی ہے۔'' [۱۹]

اس خودنوشت میں انھوں نے اس دور کی اہم ادبی و سیاسی تحریکوں اور مختلف شعری و ادبی رویوں پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔نویں قسط شمارہ جنوری ۱۹۹۰ء میں وہ ترقی پسند تحریک کے حوالے سے لکھتی ہیں:

> ''اس تحریک کا جو خالص سیاسی پہلو تھا اس سے اختلافات بھی اسی زمانے میں شروع ہوگئے تھے۔ ان اختلافات کی ایک بڑی وجہ خود اس تحریک کے سرپرستوں کا انتہا پسند رویہ تھا۔جنھوں نے اس کی والہانہ پذیرائی سے متاثر ہوکر رفتہ رفتہ اسے ایک ناقابل ترمیم دستور کی حیثیت سے دیکھا،جن میں سیاسی نظریات کو انسان کے بنیادی جذبات اور احساسات پر برتری حاصل تھی۔''
>
> (ص۱۷)

پروفیسر لالہ ایش کمار کی خودنوشت ''یادوں کا کارواں'' کے عنوان سے شمارہ جنوری ۱۹۹۱ء کے شمارہ سے شروع ہوئی۔وہ جھنگ اور ۱۹۳۴ء۔۱۹۳۶ء میں کیمبل پور(اٹک) میں انگریزی کے پروفیسر رہے۔جھنگ میں ان کے شاگردوں میں پاکستان کے نوبل انعام یافتہ ڈاکٹر عبدالسلام شامل تھے۔کیمبل پور سے تبدیل ہوکر وہ ایمرسن کالج ملتان سے وابستہ ہوگئے۔پھر وہاں سے گورنمنٹ کالج لاہور میں، جہاں وہ ہندوستان کے بٹوارے تک رہے۔ہندوستان میں وہ گورنمنٹ کالج لدھیانہ کے پرنسپل اور بعد میں پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔[۲۰] اپنی پیدائش کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر لالہ ایش کمار لکھتے ہیں:

> ''دراصل ہم زمانے سے ہمیشہ ہی پیچھے رہے۔وقت پر وقت کو کبھی قابو نہ کر سکے۔

جب ہوش سنبھالا تو معلوم ہوا کہ ہم ایک گاؤں میں رہتے ہیں جس کا نام رنگ پور کھیڑا ہے۔ اور میں اسی گاؤں میں پیدا ہوا تھا۔ مگر ان پڑھ گاؤں میں میری پیدائش کی تاریخ مجھے کوئی نہ بتا سکا۔۔۔ اسکول میں داخلے کے وقت ایک فرضی تاریخ لکھوادی گئی۔'' (قسط ا،ص ۱۹)

منشی پریم چند کی خودنوشت دیا نرائن نگم نے ''منشی پریم چند کی کہانی ان کی زبانی'' کے عنوان سے مرتب کیا اور افکار نے اسے ستمبر ۱۹۹۱ء کے شمارہ میں شائع کیا ہے۔ پریم چند نے بڑی سادگی اور سچائی سے اپنی زندگی اور ماضی سے پردہ اٹھایا ہے۔

''میرا جنم ۱۸۸۰ء میں ہوا، والد ڈاک خانے میں کلرک تھے، والدہ مریض تھیں ،ایک بڑی بہن بھی تھی۔ اس وقت والد شاید بیس روپے پاتے تھے۔'' (ص ۱۷)

پریم چند نے اس خودنوشت میں اپنی ابتدائی تعلیم میٹریکولیشن، انٹر کے حوالے سے بات کی ہے شہر میں منتقل ہونے اور پڑھنے پڑھانے کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اتفاق سے ایک وکیل صاحب کے لڑکوں کو پڑھانے کا کام مل گیا۔ پانچ روپے تنخواہ ٹھہری میں نے دو روپے میں گزر کر کے تین روپے گھر دینے کا مصمم ارادہ کیا۔ وکیل صاحب کے اصطبل کے اوپر ایک چھوٹی سی کچی کوٹھری تھی اس میں رہنے کی اجازت مل گئی ایک ٹاٹ کا ٹکڑا بچھالیا، بازار سے ایک چھوٹا سا لیمپ لے آیا اور شہر میں رہنے لگا، گھر سے کچھ برتن بھی لے آیا ایک وقت کھچڑی پکالیتا اور برتن دھو مانج کر لائبریری چلا جاتا۔'' (ص ۱۹)

بیگم حمیدہ اختر حسین کی خودنوشت ''ہم سفر'' کے عنوان سے اگست ۱۹۹۳ء سے دسمبر ۱۹۹۴ء کے شمارہ تک ۱۷ قسطوں پر مبنی ہے۔ اس خودنوشت میں ان کا طرزِ تحریر سادہ اور پُرکار ہے۔ اختر حسین رائے پوری سے اپنی پہلی ملاقات کے بارے میں لکھتی ہیں:

''میں نیچے چنبیلی کی بیل سے جوان صاحب کے کمرے کی کھڑکی کو ڈھانپتی ہوئی اوپر چھت پر چڑھ گئی تھی۔ پھولوں سے لدی ہوئی تھی۔ کچھ پھول توڑنے رُک گئی ۔جب مٹھی بھر پھول توڑ کر پہلی سیڑھی پر قدم رکھا تو برآمدے سے ''وہ لڑکا'' نیچے

اتر رہا تھا۔''(ص ۲۸)

اختر حسین رائے پوری کا تعارف دیکھئے کن الفاظ میں کرواتی ہیں۔انھوں نے جو کچھ اس وقت محسوس کیا اور ان کے بارے میں سوچا،اس کی ہو بہو عکاسی یوں کی ہے:

> ''حیرت اور غور سے سر اٹھا کر دیکھنے لگی کہ ہاں سچ تو ہے جھوا بھر بال،لمبی قلمیں موٹے موٹے ہونٹ،روسیکٹ کی قمیص،بے ساختہ ہنسی آنے لگی۔وہ مجھے یوں گھورتا اور حیرت زدہ محسوس کر کے آہستہ آہستہ رک رک کر نیچے اترنے لگا۔ جب ایک سیڑھی درمیان میں رہ گئی تو میں نے ہمت کر کے کہا مہربانی کر کے مجھے ''نگار'' کا وہ پرچہ دے دیجیے جس میں آپ کا افسانہ ''زبان بے زبانی'' چھپا ہے۔اختر کے ہنسنے میں موٹے ہونٹ اور بھی موٹے لگنے لگے۔یہ کہتے ہوئے آخری سیڑھی اترے ''خوب رہی پہلے ہمارے پھول چوری چوری توڑے،اب دیدہ دلیری سے ''نگار'' مانگ رہی ہیں۔'' (ص ۲۸،۲۹)

مکر وفریب کے اس دور میں جھوٹ اور مبالغہ سے پاک ایک ایسی خودنوشت ہے جس پر سچائی سادگی اور ایمانداری کی مہر لگی معلوم ہوتی ہے۔[۲۱] اس پر کسی ناول کا گمان ہوتا ہے لیکن آپ بیتی میں جو لطف اور مزہ ہے وہ جگ بیتی میں کہاں۔[۲۲] بقول مشفق خواجہ:

> ''ہم سفر کے صفحات میں مصنفہ نے اپنی یادوں کے حوالے سے جو دنیا آباد کی ہے وہ بظاہر ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے ساتھ گزرے ہوئے لمحوں کی روداد ہے لیکن اس دنیا میں کئی اور دنیاؤں کی سیر بھی شامل ہے۔۔اسلوب بیان ایسا دلکش ہے کہ پڑھنے والا وہ کہیں اور سنا کرے کوئی ، کے طلسم میں اسیر ہو جاتا ہے۔''[۲۳]

آئینہ در آئینہ حمایت علی شاعر کی منظوم خودنوشت سوانح حیات ہے۔ جو کہ اگست ۱۹۹۵ء کے شمارے سے شروع ہوتی ہے اور ستمبر ۱۹۹۹ء کے شمارے تک جاری رہتی ہے۔ یہ خودنوشت پچاس (۵۰) اقساط پر مشتمل ہے۔اس خودنوشت میں حمایت علی شاعر نے اپنے روز وشب اور حالات زندگی کا احوال منظوم انداز میں قارئین کے سامنے پیش کیا۔نکہت بریلوی لکھتے ہیں:

''تین ہزار اشعار پر مشتمل سوانحی نظم نہ صرف یہ کہ طویل ترین ہے بلکہ اسے اردو
کی پہلی منظوم خودنوشت سوانح حیات ہونے کا بھی اعزاز حاصل ہے۔''[۲۴]

پہلی قسط اگست ۱۹۹۵ء میں اپنے آبائی شہر کے بارے میں بات کرتے ہوئے انھوں نے حواشی میں بہت سی تاریخی معلومات بہم پہنچائی ہیں۔انھوں نے اورنگ آباد کی تاریخی حیثیت کے بارے میں کچھ اس طرح معلومات کو اکٹھا کر کے پیش کیا ہے کہ وہ محکمہ سیاحت آندھرا پردیش کے بروشرز کا حصہ بن سکتے ہیں۔وہ اس شہر کے بارے میں تاریخ کے اوراق الٹتے چلے گئے ہیں۔نظروں میں ایلورا،اجنتا سے لے کر تغلق اور مغل دور اور اورنگزیب وشیواجی کے معرکوں سے گزرتے ہوئے ہم ولی دکنی سے مولوی عبدالحق کے زمانے تک آتے ہیں۔[۲۵] پس منظر کے عنوان حمایت علی شاعر سے لکھتے ہیں:

یہ شہر جس کو سب'' اورنگ آباد'' کہتے ہیں　　یہاں پہ صدیوں سے میرے بزرگ رہتے ہیں
بہت زمانہ ہوا اس کا نام'' کھڑکی ''تھا　　جو''فتح خان'' کے ہاتھوں''فتح نگر''بھی ہوا
(ص۲۸)

مصنف نے اپنی خودنوشت میں اپنے اردگرد کے حالات،اپنے بچپن اور اپنے دوستوں اور مختلف معاشرتی قدروں کے حوالے سے بات کی ہے۔دوسری قسط شمارہ ستمبر ۱۹۹۵ء میں حمایت علی شاعر اپنے گھرانے کے بارے میں لکھتے ہیں:

میں جس گھرانے کا ہوں فرد مذہبی تھا بہت　　طریقتی بھی تھا لیکن شریعتی تھا بہت
فقیہہ وصوفی وملا ،مرے اَب وجَد تھے　　بڑے نمازی ،تہجد گزار، سید تھے
(ص۲۳)

حاشیے میں طریقتی سے مراد سید نوراللہ حسینی جو کہ حمایت علی شاعر کے جدِ اعلیٰ اور اورنگ زیب کے زمانے میں رنجن گاؤں میں سکونت پذیر تھے جبکہ شریعتی سے مراد مفتی ضیایار جنگ اور دوسرے بزرگ جو ریاست میں اہم عہدوں پر فائز تھے۔حمایت علی شاعر کی منظوم خودنوشت کے بارے میں بات ڈاکٹر محمد علی صدیقی لکھتے ہیں:

''میں حمایت علی شاعر کی منظوم سوانح حیات کو تاریخ کے سماجی ومعاشی مکتب فکر کی
اطلاقی شکل سمجھتا ہوں جو کم سے کم ترقی پسندانہ فکر سے عبارت ہے اور زیادہ سے
زیادہ مارکسی نقطۂ نظر سے متاثر سمجھی جاسکتی ہے۔حمایت علی شاعر نے قوم پرستانہ

،افادیت پسند اور تاثراتی مکاتبِ فکر سے انحراف کیا ہے۔''[۲۶]

اس خودنوشت میں حمایت علی شاعر نے اپنے دوستوں، نامور ادباء وشعراء اور عزیز واقارب کے حوالے سے بھی لکھا ہے جن میں جوش، مخدوم، مجاز، نیاز، فیض، راشد، عصمت چغتائی، میراجی، بیدی، مجروح، ساحر، سردار جعفری، کرشن چندر، ندیم، فراق، کلیم الدین احمد، احتشام حسین وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

ہمارے بعض شاعروں نے اپنے مخصوص ذاتی واقعات یا خاندانی حالات کو انفرادی طور پر تو اکثر نظم کیا ہے مگر پوری خودنوشت کسی نے نہیں لکھی اور غالباً اردو میں یہ پہلی کوشش ہے جو یقیناً قابل داد ہے۔ حمایت علی شاعر کی منظوم خودنوشت اپنی جگہ ایک منفرد تخلیقی کاوش ہے۔ انھوں نے اردو زبان کو منظوم خودنوشت دے کر اس کے ادبی وشعری خزانوں میں اضافہ کیا ہے۔ حمایت علی شاعر کی خودنوشت کے بارے میں آفاق صدیقی لکھتے ہیں:

> ''یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ محض رسمی طور پر نہیں بلکہ تاریخی حقائق اور بھرپور ادبی شعور کے ساتھ برادرم حمایت علی شاعر کی منظوم خودنوشت کی چند قسطیں شائع ہوچکی ہیں جن کو پڑھ کر نہ صرف یہ کہ ایک صف اول کے شاعر کی زندگی کا عکس ہمارے سامنے منظوم کیفیات کے ساتھ آتا ہے بلکہ یہ احساس بھی جاگا کہ اگر شعر کہنے کا اچھا شعور وادراک ہو تو خودنوشت کے تلخ وشیریں حقائق کو بھی بڑی جامعیت سے شاعری کے پیکر میں ڈھالا جاسکتا ہے۔''[۲۷]

افکار ستمبر ۱۹۹۹ء قسط ۵۰ (آخری) میں حمایت علی شاعر نے جنرل ضیاء الحق کے دور پر روشنی ڈالی ہے اور اپنے بیٹوں بیٹیوں کا ذکر کیا ہے۔ حمایت علی شاعر کی خودنوشت کے اشعار اتنے پیچیدہ اور مشکل نہیں ہیں لیکن پھر بھی جگہ جگہ حمایت علی شاعر چھوٹی چھوٹی باتوں اور لفظوں کی تشریح وتوضیح میں الجھ جاتے ہیں۔

علی سردار جعفری کی خودنوشت افکار نومبر دسمبر ۱۹۹۱ء سردار جعفری نمبر میں شائع ہوئی۔ صلاح الدین اکبر کی خودنوشت یادداشتیں کے عنوان سے ستمبر ۲۰۰۰ء کے شمارہ میں شائع ہوئی۔ پریم چند کی بیگم شیورانی کی یاداشتیں ڈاکٹر حسن منظر نے مرتب کیں۔ پہلی قسط اگست ۱۹۹۴ء کے شمارہ میں اور آخری نومبر ۱۹۹۶ء میں شائع ہوئی۔

افکار نے اردو خودنوشتوں کو بحیثیت ایک صنف وہ مقام عطا کیا ہے جو کہ اردو کی دوسری ممتاز ومعروف اصناف سخن کو حاصل رہا ہے۔ افکار کے صفحات اپنے آغاز سے لے کر تاحال اردو ادب کی ممتاز وقدآور اور رجحان ساز شخصیات کی سوانح عمریوں سے مزین ہے۔ یہ سوانح عمریاں نہ صرف ان شخصیات کی نفسیاتی ومعاشرتی زندگی کی

مختلف پرتوں کو کھولتی ہیں بلکہ یہ اس دور کی ادبی و سیاسی مزاج اور تہذیبی و معاشرتی رویوں کی غماز بھی ہیں۔علی جواد زیدی لکھتے ہیں:

> ''افکار کی ایک اور خصوصیت ادیبوں کی ذاتی یادداشتوں کی اشاعت ہے اس سلسلے کی کئی کڑیاں شائع ہو چکی ہیں۔ پریم چند کی اہلیہ، اختر حسین رائے پوری کی رفیقۂ حیات جیسی شخصیتوں کو یکجا کر کے انھوں نے یہ واضح کر دیا کہ ادیبوں کی شخصیتوں کے پیچھے ان کو سنبھالے رکھنے والے ہاتھ ادبی اعتبار سے بھی کتنے حسین ہیں۔''[۲۸]

اردو میں خودنوشت نگاری کی روایتنہ صرف پرانی ہو چکی ہے بلکہ پختہ بھی۔خاص کر پاکستان کے قیام کے بعد تو اس نے زیادہ ترقی کی ہے۔اس وقت بھی بھی شائع ہونے والی خودنوشت سوانح عمریوں کی تعداد حوصلہ افزا ہے۔شائع ہو جاتی ہیں ان کے مصنفین میں شاعر، ادیب، صحافی، افسانہ نگار، ناول نویس، مؤرخ، معلم، سیاستدان اور سفارتکار غرض ہر طبقے کے افراد شامل ہیں۔[۲۹] ان اشاعتوں کا اصل محرک درحقیقت افکار میں شائع ہونے والی معرکتہ الآرا خودنوشتیں ہی ہیں جنھوں نے ادباء و شعرا اور مختلف اصناف ادب لکھنے والوں کو خودنوشت نگاری کی طرف مائل کیا۔

حوالہ جات

۱۔ آل احمد سرور، خواب باقی ہیں، ص ۷، ۸، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۹۱ء

۲۔ احمر رفاعی، فن سوانح نگاری ایک نظر مشمولہ ماہنامہ نگار کراچی، جنوری فروری ۱۹۶۷ء ص ۴۳

۳۔ معین الدین عقیل (مرتب)، بیتی کہانی، ادارہ علمی حیدرآباد دکن، ۱۹۹۵ء، ص ۸

۴۔ فرزانہ کوکب، اردو آپ بیتی میں مابعد الطبیعاتی عناصر، ماہ نو لاہور، فروری مارچ ۱۹۹۷ء، ص ۷۷

۵۔ محمد احمد سبزواری، ادا جعفری کی خودنوشت جو رہی سو بے خبری رہی پر ایک نظر، افکار کراچی، دسمبر ۱۹۹۵ء، ص ۳۰

۶۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، نصف صدی کا قصہ مشمولہ صہبا لکھنوی شخصیت اور فن، مرتبہ نکہت بریلوی، کراچی ارتقا مطبوعات، ۱۹۹۹ء، ص ۱۶۸

۷۔ علم الدین سالک، آپ بیتیوں کے چند نمایاں پہلو، نقوش لاہور، آپ بیتی نمبر، جون ۱۹۶۴ء، ص ۴۱

۸۔ عبداللہ، سید ڈاکٹر، آپ بیتی، نقوش لاہور، آپ بیتی نمبر، ۱۹۶۴ء، ص ۶۱

۹۔ آل احمد سرور، خواب باقی ہیں، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۹۱ء، ص ۷

۱۰۔ محمد سعید، حکیم، کلمات صدارت، افکار کراچی، جنوری ۱۹۸۷ء، ص ۲۴

۱۱۔ ندیم احمد ڈاکٹر، بیسویں صدی میں خودنوشت سوانح عمری، جرنل پٹنہ شمارہ ۱۲۹، جولائی ستمبر ۲۰۰۲ء، ص ۱۲۹

۱۲۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، ماہنامہ نگار کراچی، اکابر ادب نمبر، دسمبر ۲۰۰۳ء، ص ۱۸۴

۱۳۔ اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر، گرد راہ، مکتبہ افکار کراچی، اگست ۱۹۹۴ء بار دوم، ص ۳۱۷

۱۴۔ محمد احمد سبزواری، ۱۹۹۴ء کی افکار فائل پر ایک نظر، افکار کراچی، اپریل ۱۹۹۴ء ص ۳۷

۱۵۔ واصل عثمانی، یاران محفل مشمولہ افکار کراچی، جون ۱۹۸۷ء، ص ۹۷

۱۶۔ انور سدید، ڈاکٹر، یاران محفل، افکار کراچی، فروری ۱۹۸۹ء، ص ۹۷

۱۷۔ انور سدید، ڈاکٹر، افکار کا ایک سال ۱۹۸۸ء، مشمولہ افکار کراچی مئی ۱۹۸۹ء، ص ۳۰، ۳۱

۱۸۔ محمد احمد سبزواری، ادا جعفری کی خودنوشت، جو رہی سو بے خبری رہی، افکار کراچی دسمبر ۱۹۹۵ء ص ۳۱

۱۹۔ ندیم احمد، ڈاکٹر، بیسویں صدی میں خودنوشت سوانح عمری، ص ۱۳۷

۲۰۔ تعارف از سید ضمیر جعفری، پہلی قسط، افکار کراچی، جنوری ۱۹۹۱ء، ص ۱۷

۲۱۔ ندیم احمد، ڈاکٹر، بیسویں صدی میں خودنوشت سوانح عمری، ص ۱۳۶

۲۲۔ محمد احمد سبزواری، ۱۹۹۴ء کی افکار فائل پر ایک نظر، افکار کراچی اپریل ۱۹۹۴ء، ص ۳۷

۲۳۔ مشفق خواجہ، دیباچہ ہم سفر از حمیدہ اختر حسین رائے پوری، دانیال کراچی، ۱۹۹۶ء بار دوم، ص ۱۴، ۱۵

۲۴۔ نکہت بریلوی، بر سبیل آئینہ در آئینہ، افکار کراچی، ستمبر ۱۹۹۹ء، ص ۲۱

۲۵۔ محمد علی صدیقی، ڈاکٹر، آئینہ در آئینہ ایک منفرد شعری دستاویز، فنون لاہور، شمارہ ۱۱۸، ص ۶۷
۲۶۔ محمد علی صدیقی، ڈاکٹر، فنون لاہور، ص ۶۸
۲۷۔ آفاق صدیقی، یاران محفل، افکار کراچی، مارچ ۱۹۹۶ء، ص ۸۴
۲۸۔ علی جواد زیدی، صہبا ادارہ ساز ادارہ مشمولہ صہبا لکھنوی شخصیت اور فن، مرتبہ نکہت بریلوی، ص ۹۷
۲۹۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، امراؤ طارق (مرتبین)، دیباچہ از امراؤ طارق مشمولہ خود نوشت اور تنقید خود نوشت، الوقار پبلیکیشنز لاہور ۱۹۹۸ء